OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

تصوف اور قرآن: ایک مطالعہ
A Study of Mysticism and Quran

Syeda Tayyaba Rubab
Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. Graduate College for Women Karkhana Bazar Faisalabad
Dr. Balqees Akhtar
Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. Associate College for Women, Shahkot

Abstract
Mysticism is a spiritual way of living which assesses a person inertly and help to promote his special qualities. Islam guides a man to make him spiritually pure and strong person in order to establish peace and justice. Every verse of Quran has inner meaning by her existence. The Islamic mysticism is reflected by Quran and Ideal personalities.
Key words: Mysticism, Human, Soul, Depth, Purification, Internal, Qualities

تمہید
لفظ ''تصوف'' کا تحقیقی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف ''صوف'' سے مشتق ہے۔ صوف کا مطلب ہے اُون کا لباس چونکہ صوفیا لباس کی آرائش و زیبائش سے بے نیاز ہوتے ہیں اور اکثر اُون کا لباس پہنتے رہے تاکہ نفس سختی کا عادی ہو، اِس لیے صوفی کہلائے۔ نوراللغات میں تصوّف کا مطلب ہے جس کے معنی کنارا کرنا، منہ پھیرنا۔''[1] فیروزاللغات میں تصوّف کا مطلب ہے: ''(۱) صوفیوں کا عقیدہ، (۲) علمِ معرفت، (۳) دل سے خواہشوں کو دُور کر کے خدا کی طرف دھیان لگانا، (۴) تزکیۂ نفس کا طریقہ، (۵) پشمینہ پہننا۔''[2] فرہنگِ آصفیہ میں تصوّف کی تعریف یوں ہے: ''خواہشِ نفس سے پاک ہونا، وہ علم جس کے وسیلے سے صفائی قلب حاصل ہو۔ تزکیۂ نفس کا طریقہ اشیائے عالم کو مظاہرِ صفاتِ حق جاننا قطع عن الغیر یعنی سوائے واجب الوجود کے سب اشیاء کو موہوم اور لاموجود سمجھ کے مشغولی کے لائق نہ جاننا۔''[3] یوں تصوّف کی ایک مشترک تعریف یہ سامنے آتی ہے کہ علمِ معرفت اور تزکیۂ نفس کے ذریعے دل کو خواہشوں سے پاک کر کے ماسویٰ اللہ کا عملی اِنکار کرنا، بعض نے اصحابِ صفہ اور بعض نے ''صفا'' سے بھی منسوب کیا ہے۔ غور کیا جائے تو مطلب ایک ہی ہے۔ اصحابِ صفہ عبادت و ریاضت کے ذریعے تزکیۂ

نفس اور دل کو آلائشوں سے پاک کرتے اور اہلِ صفا بھی پاک لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں تصوّف کی تشریح اِس طرح ہے: ”تصوّف سے مراد یہ ہے کہ ظاہر میں آدابِ شریعہ کی ایسی پابندی اختیار کی جائے کہ اِس کا حکم باطن سے ظاہر میں بھی پایا جائے جس سے ان دو پابندیوں کو اختیار کرنے والے کو کمال حاصل ہو جائے۔“[4] اُردو انسائیکلوپیڈیا میں تاریخِ تصوّف کے متعلق لکھا ہے: ”اسلام میں ملوکیت کا آغاز ہوا تو مسلمانوں میں خود بخود دو گروہ بن گئے۔ ایک برسرِ اقتدار طبقہ اور دوسرے زہاد و عباد کا گروہ۔ اِبتدائے اِسلام میں ”فقر و جہاد“ یکجا تھے، مگر دورِ ملوکیت میں جہاد کی جگہ رنگینیوں نے لے لی اور فقر زہاد و عباد کے حصے میں آیا اور وہ گوشہ نشین ہو کر عبادتِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو مسلمانوں کی کشمکش سے بیزار ہو کر عزلت نشین ہو گئے۔“[5] تصوّف یا صوفی ازم کے لیے طریقت کی اِصطلاح بھی رائج ہے۔ تمام اسلامی احکامات شریعت کی صورت میں موجود ہیں۔ شریعت کے باطن کو طریقت کہا جاتا ہے۔ این میری شیمل اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

> "The tariqa, the "path" on which the mystics walk, has been de-fined as "the path which comes out of the shari'a, for the main road is called shar, the path, tariq." This derivation shows that the Sufis considered the path of mystical education a branch of that high-way that consists of the God-given law, on which every Muslim is supposed to walk. No path can exist without a main road from which it branches out; no mystical experience can be realized if the binding in junctions of the shari'a are not followed faithfully first."[6]

ڈاکٹر انور سدید تصوّف کی توضیح اِس طرح کرتے ہیں: ”تصوف ”انسان کیا ہے“ کے بجائے انسان کو کیا ہونا چاہیے“ پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اور عبادت کو ایک ایسے رُوحانی جذبے میں تبدیل کر دیتا ہے، جس کی نگاہ میں ہر انعام بے وقعت ہو جاتا ہے۔“[7] عملی طور پر تصوف ایک ایسا باطنی سفر ہے جو انسان کو گناہوں اور خواہشاتِ نفسانی سے دُور کر کے قربِ الٰہی کی منزل پہ فائز کر دیتا ہے۔ تصوّف کی اِصطلاح میں اِس سفر پہ گامزن انسان کو صوفی یا سالک کہتے ہیں جو سلوک کی منازل طے کرتا ہے۔ صوفیا کے اقوال کی روشنی میں تصوّف کی مختلف تعریفیں سامنے آتی ہیں۔ جنیدؒ کے اُستاد محمد بن علی سے پوچھا گیا کہ تصوّف کیا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: ”تصوّف ان کریمانہ اخلاق کا نام ہے جو کسی کریم زمانہ میں کسی کریم شخص سے شریف لوگوں کے سامنے ظہور پذیر ہوں۔ جنیدؒ سے تصوّف کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: ”تصوّف یہ ہے کہ تو اللہ کے پاس بغیر کسی تعلق کے رہے۔“ منونؒ سے تصوّف کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا: ”تو نہ تو کسی چیز کا مالک ہو نہ کوئی چیز تمہاری مالک ہو۔“ ابو محمد جریری سے سوال کیا گیا تو فرمایا: ”تصوّف نام ہے ہر قسم کے بلند اخلاق کے اندر داخل ہونے کا اور ہر قسم کے کمینے اخلاق سے باہر نکل جانے کا۔“ عمر بن عثمان مکی سے پوچھا گیا تو فرمایا: ”تصوّف یہ ہے کہ بندہ ہر لحہ ایسے (عمل میں) مشغول ہو جو اس لمحے کے لیے زیادہ مناسب ہو۔“[8] امام محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام نے فرمایا: ”اَلتَّصوُّفُ خُلْقٌ فَمَنْ زَادَ عَلَیْکَ فِی الخُلْقِ زادَ عَلَیْکَ فِی التَّصُّوف“ (تصوّف نیک خوئی اور خوش اخلاقی ہے جو زیادہ نیک خو ہو وہ زیادہ صوفی ہوتا ہے۔“ ابو الحسن علی بن عثمان ہجویری اس قول کی تفسیر یوں کرتے ہیں: ”نیک خوئی کی دو صورتیں ہیں۔ خدا کے ساتھ اور بندوں کے ساتھ خدا کے ساتھ نیک خوئی اس کے احکام کی پابندی ہے۔ بندوں کے ساتھ نیک خوئی یہ ہے کہ صرف خدا کے لیے ان

سے میل جول بر قرار رکھا جائے یہ دونوں صورتیں طالب سے متعلق ہیں کیونکہ باری تعالیٰ کی ذاتِ اقدس انسانی فرماں برداریوں یا انسانی برگشتگی سے بے نیاز ہے اور دونوں کا انحصار توحیدِ خداوندی کے عرفان پر ہے۔"[9]

عارف کی تعریف

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:"عارف کی تعریف یہ ہے کہ جو اپنے مولیٰ کی اطاعت میں ہمہ تن مشغول رہے۔" فرمایا کہ "صاحبِ کرامت وہ ہے جو اپنی ذات کے لیے نفس کی سرکشی سے آمادہ بجنگ رہے کیونکہ نفس سے جنگ کرنا اللہ تعالیٰ تک رسائی کا سبب ہوتا ہے"[10] ذوالنونؒ نے صوفی کی تعریف یوں کی ہے:"صوفیا وہ ہیں جنھوں نے تمام چیزوں پر خدائے عزوجل کو ترجیح دی اور اس کو پسند کر لیا اور خدائے عزوجل نے بھی انھیں تمام چیزوں پر ترجیح دی اور پسند کر لیا۔"[11] معنوی حوالے سے غور کیا جائے تو تصوّف کی تاریخ اتنی ہی پُرانی ہے جتنی کہ تاریخ انسانیت۔ انسان اپنی اصل سے جدا ہو کر دُنیا میں آیا تو اللہ کے رازوں کا امین تھا اور اپنے باطن میں بے پناہ اسرار سمیٹے ہوئے تھا۔ خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:"ابو بشر جس جنت سے نکلے وہ رُوحِ انسانی کی رُوح الارواح سے وصل کی کیفیت تھی، وصال کے بعد زوال کا احساس دردِ فراق پیدا کرتا ہے انسان کو ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ وہ نصب العین اور مقصود سے دُور اور مہجور ہے۔ رُوحِ انسانی اپنی سرمدی حیثیت میں اگر مقصودِ حقیقی سے آشنا نہ تھی، تو یہ حرمان کا احساس اس میں کہاں سے پیدا ہوا۔ حسرت و حرماں کا احساس اس کی اصل کا غماز ہے۔ انسان کو گہری نفسی کیفیت میں اس کا مبہم سا شعور ہوتا ہے کہ وہ عالمِ آب و گل اور جہانِ رنگ و بو کا باشندہ نہیں۔ بلبلِ بوستان سرمدی خدا جانے اس قفسِ عنصری میں کس طرح محبوس ہوا۔"[12] نفسِ انسانی خیر و شر دونوں قوتوں کا حامل ہے۔ اللہ نے اپنی صفات سے اِس پیکرِ خاکی کو نوازا تو ہے لیکن ساتھ ہی ابلیس کے کھلے چیلنج کا سامنا بھی ہے۔ شاید ان دونوں قوتوں کا برسرِپیکار رہنا ہی کائنات کا مقدر رہے۔ اچھائی اور بُرائی کا الہام قدرتِ حق نے انسان کو ودیعت کر دیا ہے۔"فَاَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا"[13] پھر بُرائی اور تقویٰ کا الہام کر دیا۔

باطن کا سفر

باطن کا سفر بہر حال درپیش ہے۔ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی باطن سے بے نیاز نہیں رہ سکتا یہ اور بات ہے کہ یہ سفر خیر کی جانب ہے یا شر کی جانب۔ خیر کا سفر انسان کو اِس کے مقام سے آشنا کرتا ہے یہی رُوحِ تصوّف ہے اس سفر میں انسان کو مادیات، رسم و رواج، خواہشِ نفس، ہر طرح کے بتوں کو توڑنا ہوتا ہے۔ تب جا کر اسے معرفتِ نفس حاصل ہوتی ہے کہ یہ اس رُوح کا امین ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے:"نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِي"[14] اس میں اپنی روح پھونکی قرآن پاک کی رو سے اللہ کی حدوں کو توڑنے والا ظالم ہے۔"وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ"[15] اور جو حدود اللہ سے تجاوز کرے پس وہی لوگ ظالم ہیں۔ گویا سالک کے لیے حدود اللہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو کہ احکامِ شریعت کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں اور باطنی حدود کا خیال رکھنا سالک پہ اللہ کی ایسی عنایت ہے جس سے عام انسان فیض یاب نہیں ہو سکتا جو اس کی معرفت نہیں رکھتا۔ اسی سبب وہ خدا کا ولی بن سکتا ہے ورنہ خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے:"اَنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْم"[16] بے شک شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ ظالم ہے وہ جو کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا دے تو خدا کا شریک ٹھہرانا، اس کے مقام کو گرانا ہے۔ ایک صوفی خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے خواہشاتِ نفسانی کے بتوں کو توڑ کر شرک سے نجات حاصل کرتا ہے۔ بے شک انسان کا نفس ہی سب سے بڑا بُت ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:"اَفَرَئَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰائهٗ"[17] کیا تو نے ایسے شخص کو دیکھا جس نے خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔ نفس کے بتوں کو توڑ کر ہی اللہ کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے، ورنہ تو وہ ایسی بے کراں ہستی ہے کہ عقلیں جسے پا نہیں سکتیں، نگاہیں تھک کر واپس پلٹ آتی ہیں، ذہن رسا عاجز و

درماندہ رہ جاتے ہیں۔ بحث و تکرار اور فلسفیانہ موشگافیاں الفاظ کا گورکھ دھندہ بن کے رہ جاتی ہیں۔ پس قلبِ انسانی ہی اُس کی تجلی کا مرکز ہے۔

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے[18]

مادیت

لیکن مادیت کا حجاب اور خواہشات کا سیلاب بلاخیز، رُوح کو اس تجلی کا مرکز بننے میں بڑی رُکاوٹ ثابت ہوتا ہے گویا یہ رُوحِ انسانی کے لیے سمِ قاتل ہے لیکن چلنے والے انہی کٹھنائیوں اور تاریک گھاٹیوں سے گزر کر نور کی منزل کو پا لیتے ہیں۔ یوں انسان ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں ایک طرف مادی علائق اور نفس کا شر دامن گیر ہے اور دوسری طرف رُوح کے تقاضے اور خیر کی طاقت اس کی منتظر۔ یوں تو انسان رُوح اور مادے سے تعبیر ہے لیکن اشرف المخلوقات رُوح کی وجہ سے ہے ورنہ مادی وجود تو اور بھی بہت سی مخلوقات رکھتی ہیں۔ مادیت کی نفی اس جہانِ آب و گل میں ممکن نہیں لیکن مادے کو رُوح کے تابع رکھنا ہی انسانیت ہے۔ مادی فوائد اگر رُوحانی نقصان کا باعث ہوں تو ان سے اجتناب ہی بہتر ہے۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موتی اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی[19]

انسان کو مادی علائق سے اتنا خطرہ نہیں ہوتا جتنا کہ ہوائے نفس سے۔ یہ خواہشات مثلاً حبِ جاہ، نام و نمود، لالچ، ہوس، غرور، تکبر، جھوٹ، خود غرضی، شہوت پرستی جیسے اخلاقِ رذیلہ کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہیں جو شخص اخلاقِ رذیلہ کو ختم کر کے نفس کو قابو میں رکھ سکتا ہے اس سے خدائی افعال سرزد ہونے لگتے ہیں۔ ایسے انسانوں کو دیکھ کر ہی لوگ انھیں خدا کا درجہ دینے لگتے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کی کج فہمی ہوتی ہے جس کے باعث وہ شرک کرتے ہیں۔ وہ مردانِ خدا بھی اسی طرح اللہ کے بندے ہیں جیسے باقی لوگ صرف ضبطِ نفس نے ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا کی ہوتی ہے کہ ان کی رُوح، رُوحِ کُل کے ساتھ واصل ہو کر اسی کی طاقت کا سرچشمہ بن جاتی ہے، جیسے حضرت عیسیٰؑ یا حضرت علیؑ کو کچھ لوگوں نے خدا کا درجہ دیا۔ (نعوذ باللہ)

یہ سراسر نفس کی مخالفت کا کمال ہے جس میں یہ پیدا ہو جائے اُسے مادیت کا سیلاب بھی بہا نہیں لے جا سکتا۔ باطن کے اس سفر میں جوں جوں اخلاقِ سیئہ ختم ہوتے جاتے ہیں، اخلاقِ فاضلہ اُسی رفتار سے پروان چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جتنی عمدہ صفات شخصیت کے اندر جاگزیں ہوتی جائیں اُسی قدر رُوح پاکیزگی کا سفر طے کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ اندھیروں سے روشنی کا سفر ہے عمدہ صفات خیر اور روشنی کی طرف لے جاتی ہیں جب کہ اخلاقِ رذیلہ اندھیروں کی طرف: "اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ"[20] اللہ ایمان والوں کا دوست اور انھیں تاریکی سے نور کی طرف لے آتا ہے اور جو کفر کرتے ہیں وہ شیطان کے دوست ہیں انھیں نور سے تاریکی کی طرف لے جاتا ہے۔ اقدارِ عالیہ کے حوالے سے بات کی جائے تو قرآنِ حکیم میں ان تمام اقدار کو بیان کیا گیا ہے جو اللہ کے برگزیدہ بندوں کی صفات ہیں یہاں مختصراً ان کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اللہ کے دوست غصے پہ قابو پانے والے ہوتے ہیں: "وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ"[21] اور غصے کو پینے والے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والے اور خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ دُنیاوی مال و متاع سے بے نیاز ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر اور بباطن اس پہ قدرت رکھتے ہوں۔ بندگانِ درویش ہوس اور لالچ سے بلند و بالا ہیں۔ دُنیاوی لالچ تو ایک طرف اللہ کی عبادت بھی جنت کے لالچ میں نہیں کرتے۔ غرور و نخوت سے دُور، متاعِ عجز و نیاز سے مالامال ہوتے ہیں۔ صدق و صفا ان کا خاص شیوہ ہے۔

سچائی ان کی ذات میں راسخ ہوتی ہے۔ ذاتی زندگی سے لے کر جابر حاکم کے سامنے کلمۂ حق کہنے تک۔ سراپا صداقت ہیں، بے خوف ہیں۔

ہزار خوف ہو لیکن زبان ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق[22]

اپنی ضرورتوں کو محدود کر لیتے ہیں کیونکہ یہ ضرورت ہی ہوتی ہے جو لینے والا ہاتھ بن کر انسان کی تذلیل کرواتی ہے اور کبھی ابن الوقت بن کر مادی مفادات کی خاطر حق کی مخالفت کر کے مکر و فریب پر آمادہ کرتی ہے۔

اے فراہم کردہ از شیر ال خراج
گشتہ رُوباہ مزاج از احتیاج[23]

اولیاءاللہ کی صفات

اولیاء اللہ کا شیوہ ہے کہ ہر حال میں اللہ پر توکل کرنے والے ہوتے ہیں۔ مصائب و آلام سے نہیں گھبراتے بلکہ انھیں انعامِ خداوندی سمجھتے ہیں۔ مشکلات میں اللہ کو اپنا کارساز بناتے ہیں اور اسی سے راہِ نجات طلب کرتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں اللہ پہ توکل کرنے کے ثمرات کا تذکرہ ہے۔"وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا o وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لاَ يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا"[24]اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اُس کے لیے نجات کی راہ پیدا کرتا ہے اور اُسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جس کا خیال بھی نہیں ہوتا اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا اللہ اُس کے لیے کافی ہے بے شک اللہ اپنے حکم کا پہنچانے والا ہے اس نے ہر شے کے لیے مقدار معین کر دی ہے۔ جود وسخا ان کی خاص صفت ہے۔ علم کی سخاوت پہ آئیں تو کبھی فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں تو کبھی علومِ باطن کے اسرار و رموز آشکار کرتے ہیں کہ انسانیت فلاح پائے۔ مال کی سخاوت ہو تو اپنی ذاتی ضروریات کی اشیاء بلکہ اپنا افطار تک راہِ خدا میں دے کر خود پانی سے افطار کرتے ہیں۔ اور جان کی سخاوت میں اپنے سر بھی نوکِ نیزہ پہ چڑھا دیتے ہیں۔ جنابِ زینبؑ بنتِ علیؑ نے عصر عاشور امام حسین علیہ السلام کا سر نوکِ نیزہ پہ دیکھا تو ہاتھ اُٹھا کے فرمایا: "رَبَّنا تقبل مِنَّا ھذا القربان"[25]اے ہمارے رب ہماری اِس قربانی کو قبول فرما۔ یہ تاریخ انسانیت کی سب سے عظیم قربانی تھی جو کائنات کے سب سے سخی گھرانے نے دی جسے قرآن ذبحِ عظیم کے نام سے یاد کرتا ہے۔"يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ"[26]جو اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں-س سے اس خیال کی نفی ہو جاتی ہے کہ اولیاء اللہ گوشہ نشین اور مخلوق سے دُور ہوتے ہیں بلکہ جب بھی توحید کی گواہی کا وقت آیا انھی اولیاء اللہ نے تلوار کا جہاد بھی کیا اور مردِ میدان ٹھہرے، جیسے خواجہ اویس قرنیؒ اور حضرت عمار یاسرؓ، جو سرّ و معرفت کے حوالے سے بلند درجہ پر فائز ہیں، جنگِ صفین میں شہید ہوتے ہیں۔ میثم تمارؓ اور حسین بن منصورؒ نے سولی پہ چڑھ کے ذاتِ حق کی گواہی دی، یوں اولیاء اللہ، عبادت و ریاضت اور گوشہ نشینی ہو یا خنجر و سناں اور تیر و تلوار کا میدان کارزار، جلال و جمال کا مظہر ٹھہرے۔ سیّدالاولیاء حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہم السلام تمام غزوات کے فاتح رہے۔ اخلاصِ عمل کا یہ حال تھا زبانِ رسالت مآب ﷺ کے مطابق خندق کے دن علیؑ کی ایک ضرب قیامت تک کی ثقلین کی عبادت سے افضل ہے کیوں نہ ہو کہ اخلاص کی اس منزل پہ ہیں جہاں ذات حائل نہیں ہوتی۔ جنگ میں دُشمن نے روئے مبارک پر تھوک دیا تو تلوار سے ہاتھ روک لیا، مولانا روم فرماتے ہیں:

از علیؑ آموز اخلاصِ عمل
شیر حق را داں منزّہ از دغل

در غزا بر پہلوانے دست یافت
زود شمشیرے بر آورد دشتافت
او خدو انداخت بر روئے علیؑ
افتخارِ ہر نبی و ہر ولی
او خدو انداخت بر روئے کہ ماہ
سجدہ آرد پیش او در سجدہ گاہ
در زماں انداخت شمشیر آں علیؑ
کرد او اندر غزایش کاہلی[27]

حضرت علیؑ سے عمل کا اخلاص سیکھو شیر خدا کو (نفسانی اغراض کی) کھوٹ سے پاک سمجھو جنگ میں آپ نے ایک جنگجو کو زیر کیا پھر تلوار نکالی، اور حملہ آور ہوئے۔ اس نے (نعوذ باللہ) حضرت علیؑ کے منہ پر تھوک دیا وہ علیؑ جن پر ہر نبی اور ہر ولی کو فخر ہے۔ اس نے (نعوذ باللہ) اس چہرے پر جس کے سامنے چاند کو بھی سجدہ کرنا زیبا ہے، تھوک دیا۔ آنجنابؑ نے فی الفور تلوار ڈال دی اور اس کے ساتھ جنگ کرنے میں التوا کیا۔ مولانا رومؒ نے تفصیلاً یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اس دُشمن پر ولائت کا راز منکشف ہو گیا اور وہ مسلمان ہو گیا وہ اس واقعے کی وجہ جان چکا تھا لیکن زبانِ امیر المومنینؑ سے سننا چاہتا تھا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا:

گفت من تیغ از پئے حق میزنم
بندہ حقم نہ مامورِ تنم
سرِّ حقم نیستم شیر ہوا
فعلِ من بر دین من باشد گواہ[28]

حضرت علیؑ نے فرمایا میں اللہ کے لیے تلوار چلاتا ہوں میں اللہ کا بندہ ہوں تن کا مطیع نہیں ہوں۔ میں اللہ کا شیر ہوں شیر حرص نہیں ہوں میرا فعل میرے کمالِ دین پر گواہ ہے۔ حضرت علیؑ کا یہ عمل بتقاضائے اخلاص تھا جس نے دُشمن کو نہ صرف ورطہ حیرت میں ڈال دیا بلکہ صورتِ امیر المومنین علیہ السلام میں اُس نے جس تجلّیٔ حق کا مظاہرہ دیکھا اس کے ایمان لانے کا سبب بنا جو دُشمنِ خدا تھا۔ قرآن و سنت میں جو اخلاقِ فاضلہ کی مثالیں ہیں ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ انسان محض مادی زندگی کا اسیر نہیں بلکہ اس کی رُوح جب ترقی کی منازل طے کرتی ہے تو عالمِ لاہوت تک پرواز کے قابل ہو جاتی ہے۔ تزکیۂ نفس سے تمام مادی و نفسانی قیود ختم ہو جاتی ہیں۔ اس راستے میں شریعت رہنمائی فراہم کرتی ہے اور نتیجتاً سالک شریعت پر کامل ایمان کے ساتھ عمل پیرا بھی ہو جاتا ہے۔ احکامِ شریعت اپنے ظاہر کے ساتھ باطن بھی رکھتے ہیں اور اہلِ معرفت شریعت کے باطن پر بھی عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن باطن میں اخلاصِ عمل کے لیے باطنی پاکیزگی بھی شرط ہے۔ قرآنِ حکیم ظاہر اور باطن دونوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''وَذَرُوْ ظَاہِرَ الْاِثْمِ وباطِنَہ ''[29] تم لوگ ظاہری اور باطنی گناہ چھوڑ دو۔ صرف ظاہری احکام یا ظاہری علوم سے رُوح کی تسکین ممکن نہیں جب تک کہ وہ دل میں اُتر کر رُوحانی صورت نہ اختیار کر جائیں۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ''اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ ظاہِرِیْ بِطَاعتِکَ وَباطِنِیْ بمحَبَّتِکَ وَقَلْبِیْ بِمَعْرِفَتِکَ وَرُوْحِیْ بِمُشَاھَدَتِکَ وَسِرِیْ باسْتِقْلَالِ اِتَّصَالِ حَضْرَتِکَ یَاذَالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ'[30] اے اللہ میرے ظاہر کو اپنی طاعت سے، میرے باطن کو اپنی محبت سے، میرے قلب کو اپنی معرفت سے،

میری رُوح کو اپنے جمال کے مشاہدہ سے اور میرے دل کی گہرائی کو اپنی حضوری سے منوّر فرمایا ذاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام۔ خلوصِ نیت اجرِ عظیم سے ہمکنار کرتا ہے۔ انسان کی تمامتر حکمت و دانائی، علمِ معرفت اور رُوحانی ترفع، اخلاص کا مرہونِ منت ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: ''مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا، ظَهَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ اِلٰى لِسَانِهٖ''[31] جن لوگوں نے چالیس دن تک خلوصِ دل سے اللہ کی رضا کے لیے عمل کیا، معارفِ الٰہیہ کے چشمے ان کے دل سے پھوٹ کر ان کی زبان پر جاری ہو جائیں گے۔

توحیدِ الٰہی کا عرفان

گویا یہ اخلاصِ عمل ہی ہے جو انسان کو معرفتِ نفس عطا کر کے توحیدِ الٰہی کا عرفان عطا کرتا ہے جسے قرآنِ حکیم نے سورہ اخلاص میں بیان کیا ہے۔ اگرچہ اس مادی دور میں علومِ ظاہر نے بڑی ترقی کی ہے لیکن ان کی حیثیت حقیقت میں سرابِ ہستی سے زائد کچھ نہیں۔ محض علومِ ظاہر رُوحانی تشنگی دُور نہیں کر سکتے۔ رُوح کی تکمیل کے لیے اور کمالِ انسانیت کے حصول میں نظریاتی دینی علوم، تاریخ، فلسفہ یا سائنس کافی نہیں یہ منطقی دلائل سے ذہن کو قائل تو کر سکتے ہیں لیکن رُوح کی تسکین کا ساماں نہیں کر سکتے۔ اسلام غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے اور اطمینانِ خاطر اور سکونِ قلب حاصل کرنے کی بھی۔ قرآنی آیات میں ظاہر و باطن دونوں کے متعلق گفتگو ہے: ''وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى لا يُرَآءُوْنَ النَّاسَ''[32] اور جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو سستی کے ساتھ لوگوں کو دکھانے کے لیے یہ نفاق کی علامت ہے اس آیتِ مبارکہ میں باطنی گناہ کی طرف اشارہ ہے کہ نفس نماز پہ مائل نہیں اور اللہ کے حضور کھڑے ہونے کی رغبت نہیں۔ جس کا تعلق باطن سے ہے۔ سورہ الماعون میں ظاہری اور باطنی گناہوں کی مثال دی جا سکتی ہے کبھی ایک ہی آیت دونوں مفاہیم کی ترجمانی بھی کرتی ہے اور بقول شخصے ایک آیت کی ستّر تاویلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ سورۃ الماعون میں پہلی آیت: ''اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ''[33] کیا تو نے ایسے شخص کو دیکھا جو قیامت کو جھٹلاتا ہے۔ اس آیت کی ظاہری تشریح بھی ہو سکتی ہے اور باطنی بھی۔ بظاہر یہ کہ جو عقیدے کی رو سے جھٹلاتا ہے اور بباطن یہ کہ جو آیت کا اصل مقصود بھی ہے، اپنے اعمال سے روزِ جزا کو جھٹلانا کیونکہ یتیم سے بدسلوکی، مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دینا اور نماز میں اِخلاص کا نہ ہونا ایسے بداعمال ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کو روزِ جزا کا یقین نہیں ورنہ اس روز کی سختی سے بچنے کے لیے وہ کبھی بُرے اعمال نہ کرے۔ اسی طرح ظاہر و باطن کے پیشِ نظر: ''فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ''[34] جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اس گناہ کا تعلق بھی ظاہر و باطن دونوں سے بظاہر ایک یتیم سے شفقت سے پیش نہ آنا اور بباطن اس کا شقی القلب ہونا۔ ''وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ''[35] اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ اس آیت میں بھی ظاہری اور باطنی دونوں گناہوں کی نشاندہی ہے۔ نہ صرف مسکین کو کھانا کھلانا بلکہ اس کی ترغیب دینا بھی ضروری ہے جو ایسا نہیں کرتا بظاہر تو اس نے گناہ کیا لیکن باطنی طور پر اگر جانتا کہ خدا کی مخلوق ہے اور مال بھی اُسی کا ہے تو ایسا نہ کرتا گویا کوئی غرور یا گھمنڈ ہے جو ایسے گناہ سرزد کروا رہا ہے جو کہ اخلاقی خامی ہے۔ دینِ اسلام کا مقصد الٰہی نظام کا قیام ہے جس میں کسی انسان سے زیادتی نہیں ہوتی جو نظام کے قیام میں معاون نہیں وہ کافر ہے یا منافق۔ کفر ظاہری گناہ ہے اور نفاق باطنی۔ ''فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ''[36] نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے۔

ریاکار کی نماز

یہ سراسر باطنی گناہ ہے کیونکہ بظاہر تو نماز پڑھنا ایک مستحسن فعل ہے اور نماز تو نجات کا سبب ہے جسے نجات نہیں دیتی تو حتماً اس کے باطن پہ نماز کے اثرات مرتب نہیں ہوئے اور وہ اخلاص کی منزل تک نہ پہنچ سکا۔ نماز تو مومن کی معراج ہے جو

معراج کو نہ پا سکے اور نماز بھی پڑھے تو وہ منافق ہے اس نے دل سے پڑھی ہی نہیں بلکہ رُوح نماز سے غافل رہا۔"الَّذِیْنَ ہُمْ عَنْ صَلَاتِہِمْ سَاہُوْنَ"[37] جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ یہ بھی ظاہری اور باطنی دونوں قسم کا گناہ ہے۔ ظاہری یوں کہ نمازی مشہور ہے لیکن نماز کا وقت گزر گیا اور پروانہ کی اور باطنی یوں کہ فیوض نماز سے غافل ہے جو بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔ اِس رُوح کو نہ پا سکا صرف جسمانی مشق کرتا رہا۔"الَّذِیْنَ ہُمْ یُرَآءُوْنَ"[38] جو ریاکاری کرتے ہیں۔ اللہ پاک نے ایسے نمازی کا پول کھول دیا جو دکھانے کی نماز پڑھتا ہے نہ خود فیض یاب ہو سکا نماز کے رُوحانی ثمرات سے اور نہ سوسائٹی کو فیض یاب کر رہا ہے۔ یہ تو قانونِ قدرت ہے کہ ایک انسان دوسرے انسانوں سے جُڑا ہوا ہے اگر وہ اچھا انسان ہے باطنی خوبیاں رکھتا ہے، اس کے اندر اقدارِ عالیہ پنپ رہی ہیں تو خود بخود معاشرہ بھی اس سے اِستفادہ کرے گا اور اگر وہ اخلاص کی منزل کو نہیں پا سکا سیاہ باطن ہے اور بظاہر نیک عمل انجام دیتا ہے جیسے نماز پڑھنا، تو اس کی نماز بھی حقیقی نہیں بلکہ دکھاوے کی ہے ورنہ نماز تو بہترین عمل ہے، یہی بندے کو معبودِ حقیقی کے قریب کرتی ہے اور تاریخِ انسانی شاہد ہے کہ وہی لوگ ہمیشہ مخلوق کے حق میں بھی بہتر ثابت ہوئے جو اللہ کے قریب تھے۔ یہ ریاکار انسان اتنا گر جاتا ہے کہ:"وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ"[39] جو عام اِستعمال کے ظروف بھی عاریتاً نہیں دیتے۔ جو شخص نہ ذاتی نفع (رُوحانی) کما سکا نہ انسانیت پہ مہربان ہوا وہ اتنا گر گیا کہ دوسرے شخص کو برتن تک دینا گوارا نہیں کرتا جو اسے واپس بھی مِل جانے والا ہے، اگر کوئی غور و فکر سے کام لے تو انسان جس کو یہ زندگی بھی عاریتاً ملی ہے۔ اِس کا مادی وجود، اس کا جسم بھی عاریتاً مِلا ہے اور زندگی کے تمام لوازمات عاریتی ہیں۔ اِس کا اپنا کچھ بھی نہیں اسے لوٹ کے واپس جانا ہے۔ اپنے رب کو دیکھے جس نے اِتنا کچھ اسے عاریتاً دے دیا اگر اس کا بندہ ہوتا تو اس کی صفتِ ربوبیت کا عکس اس میں بھی نظر آتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ انسان اپنے اندر اللہ کی صفت پیدا نہ کر سکا۔ اپنے خالق کے قریب نہ ہو سکا اپنی کور باطنی اور رُوحانی تنزّل کی وجہ سے اِس قدر پست ذہنیت ہو گیا۔

رُوحِ تصوّف اور دینِ اسلام

زیرِ نظر مقالہ میں فلسفہ تصوّف پہ بحث کرنے کی گنجائش نہیں البتہ اوصافِ تصوّف یا رُوحِ تصوّف کے حوالے سے دیکھا جائے تو تصوّف یا عرفاں کوئی نیا راستہ نہیں بلکہ دینِ اسلام کی حقیقی رُوح ہے جو کتاب و سنت سے ثابت ہے۔ شریعتِ محمدیہ احکام کے ظاہر و باطن دونوں پہ نظر رکھتی ہے اور باطن کو فوقیت دیتی ہے۔ اسی طرح جیسے رُوح کو مادے پر۔ اسی لیے اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ ظاہر و باطن ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور انسان رُوح اور مادے کا ایسا سنگم ہے کہ جب اخلاصِ عمل کارفرما ہو تو صفاتِ خداوندی جلوہ گر ہوتی ہیں۔ رُوح کی تسکین صرف ظاہری احکام، ظاہری علوم یا ظاہری اعمال سے ممکن نہیں۔ اِس کے لیے باطن کی گہرائی میں اُترنا ضروری ہے جیسے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے قیمتی جواہرات نکلتے ہیں۔ اسی طرح رُوحِ انسانی کی گہرائی میں بڑے کمالات پوشیدہ ہیں۔ انھی کمالات کو پانے کے لیے تزکیۂ باطن کی ضرورت پیش آتی ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے:"لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْہِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِہِمْ یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْہِمْ وَ یُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ"[40] یقیناً خدا نے صاحبانِ ایمان پر احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان انھی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو ان پر آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے انھیں پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ سب تزکیۂ نفس اور اوصافِ حمیدہ پیدا کرنے کا ہی تو سلسلہ ہے۔ ایسے ہی پاک طینت لوگ سرد و گرم چشیدہ ہوتے ہیں کہ جن پہ قیامت کا خوف بھی ختم ہو جاتا ہے جن کا واصف خود قرآنِ حکیم ہے:"اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَ لَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ"[41] بے شک اللہ کے دوست خوف کھاتے ہیں نہ حزن کسی گزرے ہوئے مرحلے اور خوف آنے والے مرحلے کا ہوتا ہے لیکن اولیاء اللہ ماضی و مستقبل سے بے نیاز ایسے عارفانِ حق ہوا کرتے ہیں جو گردشِ شام و سحر

اور قیدِ زماں و مکاں سے آزاد تجلیٔ حق کے مظہر ہوتے ہیں۔ یہ خاص بند گانِ خدا صبر و رضا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ریاضتِ نفس اور مجاہدہ کے سبب یہ اوصاف ان کی عادتِ ثانیہ بن جاتے ہیں۔ مشکل مراحل میں اللہ کو اپنا ساتھی پاتے ہیں۔ خود خدا نے ان سے معیت کا وعدہ کیا ہے:"اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ"[42]بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ایسے ہی صبر کرنے والوں کے لیے خوشخبری ہے۔ کوئی مصیبت ان کے استقلال میں کمی کا باعث نہیں ہو سکتی۔ قرآنِ پاک کی آیت جو زبانِ زدِ عام ہے۔ درحقیقت خاصانِ خدا کی توصیف میں نازل ہوئی۔"اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ"[43]وہ لوگ جب ان پہ کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ کی طرف سے آئے اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔یعنی وہ اِس دُنیا کو جائے مصیبت بھی نہیں سمجھتے بلکہ خود کو تسلی دیتے ہیں کہ یہاں جو بھی ہو اپنے اہداف کی تکمیل میں مصروفِ عمل رہنا ہے کہ روزِ جزا سُرخرو ہو سکیں۔ مصائب و آلام میں شکوہ کناں نہیں ہوتے بلکہ انھیں انعامِ خداوندی سمجھتے ہیں اور خدا کی طرف خیر کی نسبت دیتے ہیں۔ جب واقعہ کربلا کے بعد اہلِ بیت علیہم السلام کو قیدی بنا کر کوفہ کے دربار میں لایا گیا تو ابنِ مرجانہ (ابنِ زیاد) نے طنزاً کہا:"کیفَ رالت فعل اللّٰه باھلبیتک"تم نے اپنے خاندان کے ساتھ خدا کا سلوک دیکھا ہے؟نواسیٔ رسول ﷺ بی بی زینب سلام اللہ علیہا نے فرمایا:"میں نے تو خدا کے حُسنِ سلوک کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ یہ شہید ہونے والا وہ گروہ تھا جس کے لیے خدا نے درجۂ شہادت قلمِ قدرت سے لکھ دیا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی قتل گاہ کی طرف گیا۔ عنقریب خدا انھیں اور تمھیں ایک جگہ جمع کرے گا۔ اس وقت اُس عادلِ حقیقی کی بارگاہ میں تیرا مقدمہ پیش ہو گا۔ اچھی طرح غور کر لے اُس وقت کون کامیاب ہو گا؟ اے ابنِ مرجانہ تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے۔"[44]اولیاء اللہ نفسِ مطمئنہ سے سرفراز ہو کر اس مقام پر فائز ہوتے ہیں کہ جہاں ندا آتی ہے:" يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً"[45]اے نفسِ مطمئنہ اپنے رب کی طرف لوٹ آ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی۔ اور یہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں آیتِ مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ رب کی طرف رغبت رکھنا انسان کے بس کا کام نہیں بلکہ یہ ارادۂ ایزدی ہے اور اس عہد کی استواری کا انعام ہے جو بندے نے اپنے خالق سے کیا تھا۔ اسی ایفائے عہد میں ایک عارفِ حق ایثار واِخلاص، توکل و قناعت، جود وسخا، صبر وشکر، تسلیم ورضا، عجز واِنکساری اور ضبطِ نفس جیسے اخلاق اختیار کرتا ہے۔

رضائے الٰہی

اللہ کی طرف رغبت ایسے اخلاقِ حسنہ کے صلہ میں عنایت ہوتی ہے اور پھر انسان کا ہر فعل اللہ کی رضا کے لیے ہوتا ہے:

"اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"[46]بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت عالمین کے رب کے لیے ہے۔ رضائے الٰہی میں راضی رہنے والے اس کے اِرادے کے تابع ہو جاتے ہیں۔ اِن کا نہ اِرادہ اپنا ہوتا ہے نہ نیت اور جب اِرادہ اپنا نہیں تو مراد بھی نہیں پھر اُسی کی مراد اور اُسی کا اِرادہ رہ جاتا ہے۔ یہ تسلیم و رضا کا حقیقی اور بلند مقام ہے۔ یہاں پہ دیدارِ دوست کی آرزو بھی باقی نہیں رہتی۔ اسی لیے اقبال نے کہا تھا:

شوخی سی ہے سوالِ مکرر میں اے کلیمؑ
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے[47]

جنید بغدادی سے رضا کے متعلق سوال کیا گیا تو کہا:"اپنے ذاتی اختیار کا اُٹھا دینا رضا ہے۔"قنادر حمتہ اللہ علیہ سے رضا کے متعلق پوچھا گیا تو کہا:"قضاءِ الٰہی کے گزرنے سے دل کو سکون حاصل ہونا رضا ہے۔"[48]اسلام کے معنی ہی تسلیم و رضا کے ہیں اور تسلیم کے معنی ہیں پختہ یقین، احکامِ الٰہی کے بارے میں کسی طرح کی دل گرفتگی ہونا تسلیم کے منافی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:"فَلَا

وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَاشَجَرَ بَیْنَہُمْ ثُمَّ لَایَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا"[49] آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ مومن نہیں سمجھے جائیں گے جب تک یہ اپنے آپس کے جھگڑوں میں آپ سے فیصلہ نہ کرائیں اور پھر جو فیصلہ آپ کر دیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو دل و جان سے تسلیم کر لیں۔ تسلیم کے متعلق علامہ محمد حسینؒ طباطبائی فرماتے ہیں: "اللہ تعالی کی ایسی مکمل اطاعت کہ اس کے کسی قول و فعل پر کسی طرح کا اعتراض نہ کیا جائے اور اس کا دل سے یقین رکھا جائے اور زبان سے اعتراف کیا جائے کہ جو کچھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے خالی از حکمت و مصلحت نہیں اور جو کچھ نہیں ہے وہ مناسب ہی نہ تھا۔ حضرت ربّ العزت کے کسی کام پر چون و چرا نہ کیا جائے اور نہ کسی بات کی شکایت کی جائے۔"[50] اولیاء اللہ کے فقر و قناعت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ نانِ جویں کھا کر خیبر شکن طاقت رکھتے ہیں:

فقر خیبر گیر بانانِ شعیر
بستہ ٔفتراکِ او سلطان و میر [51]

طاقت اور اِستعداد کے باوجود فقر اختیار کرتے ہیں ایسے ہی فقر پر حضور نبی کریم ﷺ نے ناز فرمایا ہے یہ فقر ایسی قوت کا اَمین ہوتا ہے کہ بادشاہت جس کی قدم بوسی کرتی ہے۔

اِک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری!
میراثِ مسلمانی، سرمایہ ٔشبیری![52]

عارفانِ حق کے استغناء کا یہ عالم ہوتا ہے کہ دُنیاوی مال و دولت، جاہ و حشم اور عیش و عشرت کو خاطر میں نہیں لاتے، ان کی رُوحانی حالت اس سے کہیں بلند وبالا ہوتی ہے۔ وہ ہوس اور لالچ کو سگِ دُنیا کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ "سیر و سلوک" میں حضرت سلمانؓ فارسی کے حوالے سے ایک واقعہ درج ہے کہ حضرت سلمانؓ مقرب صحابی تھے انھوں نے اپنا گھر نہیں بنایا تھا۔ ایک بار ایک شخص نے ان سے اجازت طلب کی کہ میں آپ کے لیے مکان بنانا چاہتا ہوں۔ آپؓ نے اِجازت نہیں دی۔ اس شخص نے کہا کہ میں جانتا ہوں آپؓ اجازت کیوں نہیں دے رہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں ایسا گھر بناؤں کہ جس کا طول و عرض اتنا ہو کہ جس میں صرف آپ ہی کی گنجائش ہو اور ایسا کوئی گھر موجود نہیں حضرت سلمانؓ نے کہا کہ ہاں یہی بات ہے۔ اس کے بعد اِس شخص نے اجازت لے کر ویسا ہی گھر بنا دیا۔ بندگانِ خدا کے فقر و استغنا کا یہی عالم ہوتا ہے۔ اس دور میں اقبال کو یہ اقدار مفقود نظر آتی ہیں، تو کہتے ہیں:

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدریؓ تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؓ[53]

یہ عمدہ صفات انسان کو یادِ الٰہی کے سبب عطا ہوتی ہیں۔ اللہ کی یاد سے جہاں انسان کو اپنے ہر ہر عمل اور ہر ہر قدم کے بارے میں سوچنے اور اپنی ذات کا محاسبہ کرنے کی توفیق عنایت ہوتی ہے، وہیں ایک صاحبِ اخلاص کے لیے یادِ الٰہی انوار کی تجلیات کا سبب بھی بنتی ہے۔ خالق اور مخلوق میں ربط اسی ذکر و فکر کی بدولت ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ پاک میں کثرت سے اللہ کو یاد کرنے کی تاکید ہے۔ "وَاذْکُرِاسْمَ رَبِّکَ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا oوَمِنَ الَّیْلِ فَاسْجُدْ لَہٗ وَسَبِّحْہُ لَیْلًا طَوِیْلًا o اِنَّ ہٰٓؤُلَآءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ وَیَذَرُوْنَ وَرَآءَ ہُمْ یَوْمًا ثَقِیْلًا "[54] اور صبح شام اپنے رب کے نام کی تسبیح کرتے رہیں اور رات کے ایک حصے میں اس کا سجدہ کریں اور بڑی رات تک اس کی تسبیح کریں۔

عبادت اور خلوت نشینی

سوورۃ دہر کی آیات ہیں اگرچہ اس کے خصوصی مصداق محمد والِ محمد علیہم السلام ہیں لیکن قرآنِ پاک ایک آفاقی کتاب ہے جس

کے عمومی مخاطب مومنین بھی ہوتے ہیں اور اگر شانِ نزول کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو اس کے مصداق بھی مثالی کردار ہیں جن کی پیروی کی اسلام دعوت دیتا ہے۔ رسولِ پاک ﷺ اِس قدر عبادت کرتے کہ اللہ پاک نے فرمایا جس قدر آپ آسانی سے عبادت کر سکیں کر لیں۔ حضرت فاطمۃ الزہراؑ ساری رات ایک سجدے میں گزار دیتیں اور فرماتیں کہ یا اللہ تیری رات کس قدر چھوٹی ہے کہ میرا ایک سجدہ بھی پورا نہیں ہوتا۔ حضرت علیؑ جب محوِ عبادت ہوتے تو رنگ زرد ہو جاتا اور آپؑ سے ایسی ایسی دُعائیں مروی ہیں کہ علم و معرفت کے دریا بہادیئے ہیں۔ دُعائے کمیل میں فرماتے ہیں:"یَارَبِّ اَسْئَلُکَ بِحَقِّکَ وَقَدسِکَ وَاعْظَمِ صِفَاتِکَ وَاَسْمَآئِکَ اَنْ تَجْعَلَ اَوْقَاتِی مِنَ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ بِذِكْرِكَ مَعْمُوْرَةً وَبِخِدْمَتِکَ مَوْصُوْلَةً وَاَعَمالِیْ عِنْدَکَ مَقْبُوْلَةً حَتّٰی تَکُوْنَ اَعْمَالِیْ وَاورَادِیْ کُلُّهَا وِرْدًاوَّاحِدًا وَحَالِیْ فِی خِدْمَتِکَ سَرْمَدًا"[55] یا اللہ میں تیرے حق اور تیری پاکیزگی اور تیری اعلیٰ صفات اور ناموں کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ میرے دن اور رات کے اوقات کو اپنی یاد سے معمور کر دے اور ہر لمحہ تیری خدمت میں بسر ہو اور میرے اعمال تیرے نزدیک مقبول ہوں یہاں تک کہ میرے اعمال اور اذکار کی ایک ہی لے ہو جائے اور مجھے تیری خدمت میں دوام حاصل ہو جائے۔ خلوت گزینی کو رسمی تصوّف کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے حالانکہ یہ خاصانِ خدا کا شیوہ ہے۔ عرفانِ نفس اور یادِ الٰہی کا بہترین وسیلہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر ولیکن
خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر[56]

خلوت نشینی کی بہترین مثال رسولِ پاک ﷺ کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ غارِ حرا میں تشریف لے جاتے جہاں ذکر و فکر اور عبادت و مراقبے میں مشغول رہتے گویا خالق سے قریب رہنے کی خاطر رحمۃ للعالمین بھی تنہائی کو پسند فرماتے گو یہ آنے والے دور کی تیاری کا مرحلہ تھا۔ اسی طرح اولیاء اللہ کو بھی کچھ دیر تنہائی میں رہنا ہوتا ہے۔ بندگانِ خدا کی رہنمائی قربِ الٰہی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ صفت انھیں مخلوق سے دُور اور فرائض سے غافل نہیں کرتی بلکہ عرفانِ ذات کا ایک مرحلہ ہے جس میں سالک کو غیر اللہ اور کج فہم لوگوں سے دُور رہنا ہوتا ہے جو حقیقتِ ابدی کا عرفان نہیں رکھتے اور زندگی کے مقصد کو فراموش کر کے آسائشِ دُنیوی میں کھو جاتے ہیں گویا مادی زندگی ہی ان کا منشاو مقصود ہو۔ ارشادِ ربّ العزت ہے:"وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا"[57] اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جنھوں نے اپنے دِین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور انھیں دُنیا نے دھوکہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ پاک طینت لوگ بصد شوق عبادات میں مشغول رہتے ہیں کیونکہ تزکیۂ نفس کی بدولت رُوح پاکیزگی کی منزل پہ ہوتی ہے اور عبادات کے باعث رُوحانی بالیدگی میسر آتی ہے۔ ان کے اعضاء و جوارح رُوح کے تابع ہوتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:"قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ o وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ"[58] یقیناً صاحبِ ایمان نے فلاح پائی جو خشوع سے نماز پڑھتے ہیں اور لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔

دنیا سے بے رغبتی

یہ لوگ لغویاتِ دُنیا سے رغبت نہیں رکھتے کہ شمعِ ایمان دل میں فروزاں ہے۔ یاد رہے کہ ان نمازیوں کو کامیاب کہا گیا ہے جو لغویات سے پرہیز کرتے ہیں کہ نماز کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ بُرائی سے روکتی ہے لیکن آج کل نماز ایک فیشن بن گیا ہے عادتاً نماز پڑھی اور لغویات میں بھی مصروف رہے جب تک لغویات سے پرہیز نہ ہو رُوح کی گہرائیاں دولتِ اخلاص کو نہیں پا سکتیں۔ یوں ساری عبادت رسمی ہو کے رہ جاتی ہے اور قربِ الٰہی کا باعث نہیں بنتی۔ کسی دل میں دین اور دُنیا کی محبت

یکجا نہیں ہو سکتی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "فَاجَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ"[59] اللہ نے کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔ جسے لہو ولعب سے دلچسپی ہو گی وہ مومن نہیں ہو گا کہ ایک دل میں ایک ہی محبت ہو سکتی ہے۔ اسی آیتِ کریمہ کو اگر عام زندگی پر بھی منطبق کیا جائے تو دیندار لوگ شاطر اور چالباز نہیں ہوتے۔ چالبازیاں دنیوی مفادات کی خاطر ہوتی ہیں اور چالباز، مکار لوگ دیندار نہیں ہو سکتے۔ یوں عام لوگوں کے اِس خیال کی تردید قرآنِ پاک سے ہو جاتی ہے کہ دین اور دُنیا دونوں کو لے کے چلو۔ دین دُنیا سے منع نہیں کرتا لیکن دُنیا کو ساتھ لے کے بھی نہیں چلتا۔ اس کا ایک اپنا دائرۂ کار ہے اس میں جو دُنیا کا حصہ قسمت سے مِل جائے وہ بھی دین ہے لیکن مادی مفادات اور نفسانی خواہشات ہمیشہ دین سے متصادم ہوتے ہیں۔

یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ[60]

اولیاء اللہ اخلاقِ سیّہ پہ قابو پانے والے ہوتے ہیں۔ ہوائے نفس کی مخالفت سے انسان میں تسخیرِ کائنات کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

مہر و ماہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر[61]

دُنیا خواہشاتِ نفسانی کا ہی نام ہے امام خمینیؒ فرماتے ہیں: "آدمی جب تک دُنیا سے منہ نہ موڑے، اپنی خواہشات کو نظر انداز نہ کر دے وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔۔۔ ہر شخص کی خواہشات ہی اس کی دُنیا ہیں اسی دُنیا کی مذمت کی گئی ہے۔ عالمِ طبیعی کی مذمت نہیں کی گئی۔"[62] مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "اے اللہ کے بندو میں تمہیں اس دُنیا کے چھوڑنے کی وصیت کرتا ہوں جو تمہیں چھوڑنے والی ہے۔ حالانکہ تم اسے چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔۔۔ دُنیا کی عزت اور اس میں فخر و سربلندی کی خواہش نہ کرو اور نہ اس کی آرائشوں اور نعمتوں پر خوش ہو اور نہ اس کی سختیوں اور تنگیوں پر بے صبری سے چیخنے چلانے لگو۔ اس لیے کہ اس کے عزت و فخر دونوں مٹ جانے والے ہیں اور اس کی آرائش اور نعمتیں زائل ہو جانے والی ہیں اور اس کی سختیاں اور تنگیاں آخر ختم ہو جائیں گی۔" سلیم الفطرت اور سلیم القلب لوگ مجاہدے اور ریاضت کے سبب اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں کہ کسی دُنیاوی فائدے پہ خوش ہوتے ہیں نہ نقصان سے رنجیدہ، زہدہ و قناعت ان کے اندر دُنیا سے بے رغبتی پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں: "لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ"[63] جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اس کا افسوس نہ کرو اور جو مِل جائے اس پر غرور نہ کرو۔ کہ یہی تقدیرِ الٰہی ہے اور یہ وقتی نفع و نقصان کوئی اہمیت نہیں رکھتا یعنی مادی سود و زیاں کو معیارِ زندگی نہ بناؤ۔

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں[64]

ایک سالک کا نفس کی قید سے آزاد ہونا یا خواہشات پہ غالب آنا آسان نہیں بلکہ خواہش کو ختم کرنے کی آرزو بھی ایک خواہش ہے یوں ایک کمزور خواہش کو ختم کرنے سے ایک طاقتور خواہش جنم لیتی ہے۔ علامہ محمد حسین طباطبائی نے "سیر و سلوک" میں لکھا ہے کہ اِس مسئلے کا حل کسی باکمال بزرگ سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ خواہش انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اسے ختم کرنے کی کوشش دوسری خواہش کو جنم دینا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ اپنے عجز کو محسوس کرے اور یہ کوشش ترک کر دے اور اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دے۔ یہ احساسِ عجز اس کی فطرت میں موجود خواہشات کو جڑ سے ختم کر دے گا اور خدا اسے ایسا راستہ دِکھلائے گا جس کا اس نے مخلصین سے وعدہ کر رکھا ہے۔

جہادِ اکبر

"وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ "[65]جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انھیں اپنے راستے دکھائیں گے اور یقینا اللہ حُسنِ عمل والوں کے ساتھ ہے۔ حدیثِ نبوی کے مطابق جہاد بالنفس جہادِ اکبر ہے اور نیک عمل کرنے والے ہی اس میں کامیاب ہوتے ہیں اور خدا انھیں اپنے قرب کے راستے ضرور دکھاتا ہے یہ اِس کا وعدہ ہے اور وہ کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ سورہ توبہ میں ارشاد ہے:"اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ "[66]جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان اور مال سے جہاد کیا وہ اللہ کے نزدیک عظیم درجہ کے مالک ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ اس آیتِ مبارکہ کی رُوحانی تاویل کی جائے تو سالکِ راہِ خدا پر پوری اُترتی ہے جو ایمان لانے کے بعد ہجرت کرتا ہے یہ ہجرت بدن سے رُوح کی طرف، ظاہر سے باطن کی طرف، اپنی ذات سے اللہ کی طرف اور فنا سے بقا کی طرف ہے جس میں اس نے زبردست جہاد کیا ہے۔ اپنے جان و مال کی پروا نہیں کی کسی مادی مفاد کی طرف آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھا۔ دُنیوی آسائشوں کے بدلے اپنی رُوح کا سودا نہیں کیا اور اپنے نفس سے لڑتا رہا یہاں تک کہ اُسے زیر کر لیا تو مجاہدین اللہ کے نزدیک عظیم درجہ رکھتے ہیں، یہی کامیاب ہیں جو اسی زندگی میں مقصدِ حیات کو پالیتے ہیں۔ یہ لوگ مجاہدے کے دوران میں اپنا محاسبہ خود کرتے ہیں۔ اِس لیے روزِ حساب سے بے خوف ہو جاتے ہیں۔ حضرت علیؑ منبر پہ فرمایا کرتے "حَاسِبُوْ قَبْلَ اَن يُحَاسَبُوْ"(اپنا حساب کرو قبل اس سے کہ تمہارا حساب ہو۔) عُرَفا اسی فرمان پہ عمل پیرا ہوتے ہیں۔ مراقبہ، ریاضت اور جہادِ نفس کی بدولت عارفانِ حق حیاتِ ابدی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔"وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ "[67]جو اللہ کے راستے میں مارے گئے انھیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب سے روزی پاتے ہیں (لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے)۔

خلاصہ بحث

جب ہم عام زندگی کی صرف ظاہری صورت سے اطمینان نہیں پاسکتے جب تک کہ باطن میں اُتر کر رُوحانی جوہر ہاتھ نہ لگے تو قرآنِ پاک کی باطنی تاویلات سے اِنکار کیونکر ممکن ہے اور اگر کوئی ایسا سمجھے کہ باطنی تاویل نہیں ہو سکتی تو قرآن پاک کی رو سے اسے سوچنا چاہیے ہو سکتا ہے وہ حقیقت کا شعور نہ رکھتا ہو۔ اہلِ باطن بابصیرت ہوتے ہیں وہ چشمِ بینا سے نہ صرف حالات و واقعات کا اِدراک رکھتے ہیں بلکہ آنے والے ادوار بھی ان کی نظر میں ہوتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے:"اَوَ مَنْ كَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا "[68]کیا جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اُسے زندہ کیا اور اس کے لیے ایک نور قرار دیا جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے اس کی مثال اس جیسی ہو سکتی ہے جو تاریکیوں میں ہو اور ان سے نکل بھی نہ سکتا ہو۔ اس مجاہدہ، ریاضت، عبادت اور معرفتِ نفس کی بدولت اولیاء اللہ کو ان کی طاقت و استعداد کے مطابق مخصوص علم عنایت ہوتا ہے۔ حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی نسبت مروی ہے کہ:"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے علم کے ستر ابواب بتا رکھے ہیں اور میرے سوا یہ علم کسی اور کو نہیں بتایا۔"[69]نفس پہ غالب آنے کی بدولت آپ علیہ السلام کا لقب ابوتراب ہوا۔ اسد اللہ ید اللہ، وجہہ اللہ جیسے القاب عنایت ہوئے اور باب مدینۃ العلم کی فضیلت نصیب ہوئی۔

مرسلِ حق کرد نامش بوتراب
حق یداللہ خواند در اُم الکتاب[70]

مرتضیٰ کز تیغ او حق روشن است
بوتراب از فتحِ اقلیم تن است
ذات او دروازۂ شہر علوم
زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم[71]

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام کو بھی مخصوص علم عطا ہوا۔ قرآنِ پاک کی رو سے حضرت موسیٰ حضرت خضر کا علم نہیں جانتے تھے۔

''کشتیٔ مسکین''، و''جانِ پاک''، و''دیوارِ یتیم''
علم موسیٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش[72]

ابو حذیفہؓ کو بھی رسولِ پاک ﷺ نے مخصوص علم عنایت فرمایا تھا: ''صحابہ میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنھیں ایک خاص قسم کا علم خصوصیت کے ساتھ حاصل تھا جیسا کہ حذیفہؓ کو منافقین کے ناموں کا علم تھا انھیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ علم راز میں بتایا تھا۔''[73] علم باطن کتابوں سے نہیں بلکہ تزکیۂ نفس اور عرفانِ نفس کی بدولت ہاتھ آتا ہے جب کسی فرد میں عمدہ اخلاق پروان چڑھتے ہیں تو پوری قوم کے لیے سربلندی کا باعث بنتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ فقر بوذرؓ صدق سلمانیؓ[74]

قیصر و کسریٰ کو جس لشکر نے فتح کیا اس میں حضرت علی علیہ السلام، حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ بنفسِ نفیس شامل نہیں تھے لیکن یہ رُوحانی صفات ان اشخاص کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں جو ملت کی اجتماعی رُوح کے تشخص کا باعث بنیں یہ مردِ مومن کی طاقت ہے اس کا فیضانِ نظر قوم کی تقدیر بدل دیتا ہے۔

References

[1] Moulvī Noor al-Hassan, *Noor al-Lughāt* (Lahore: Maqbūl Academy, 1989), 202.
[2] Al-Hāj Moulvī Ferūz al-Dīn, *Feyrūz al-Lughāt* (Lahore: Feroz Sons, n.d), 263.
[3] Moulvī Syed Ahmad Dehlvī, *Farhang-e-Āsfiya* (Lahore: Urdū Science Board, 2003), 610.
[4] Moulvī Maḥboob Ālam, *Islāmī Encyclopedia* (Lahore: Zāhid Bashīr Printers, 1992), 174.
[5] 'Abd al-Salām, *Urdū Encyclopedia* (Lahore: Feroz Sons, n.d), 323.
[6] Annemarie Schimmel, *Mystical Dimensions of Islam* (America, The University of the North Carolina Press, 1975), 98.
[7] Dr. Anwar Sadeed, *Urdū Adab kī Taḥrīkey* (Karachi: Anjuman Traqī-e-Urdū Pakistan, 1996), 154.
[8] Sheikh Abū Naṣar Ṭowsī, *Kitāb al-Lama'*, trans. Dr. Muhammad Hassan (Islamabad: Idāra-e-Teḥqeqāt-e-Islām, 1994), 59.
[9] Syed 'Alī Hajverī, *Kashf al-Mahjūb*, trans. 'Allāma Fazal al-Dīn Gohr (Lahore: Ziyā al-Qurān Publications, n.d), 93.
[10] Ḥazrat Sheikh Farīd al-Dīn 'Aṭṭār, *Tazkeyra-e-Auliyā'* (Lahore: Aslam 'Ismat Printers, n.d), 11.

[11] Dr. Meer Walī al-Dīn, *Qurān aur Taṣawuf* (Karachi: City Book Point, 2009), 160-170.
[12] Khalīfa Abd al-Ḥakeem, *Ḥikmat-e-Rūmī* (Lahore: Bilāl Jāved Printers, 2012), 17.
[13] Al-Shams 91:8.
[14] Al-Ḥijr 15:29.
[15] Al-Baqarah 2:229.
[16] Al-Luqmān 31:13.
[17] Al-Jāshiya 45:33.
[18] Meer Drd, *Dīwān-e-Drd* (Lahore: Majlis Traqqī-e-Adab, n.d), 88.
[19] Dr. Allāma Muhammad Iqbāl, *Bāl-e-Jibreel* (Lahore: Ghulām 'Alī Publishers, 1985), 56.
[20] Al-Baqarah 2:257.
[21] Al-Āl-e-Imrān 3:134.
[22] Iqbāl, *Bāl-e-Jibreel,* 35.
[23] Allāma Iqbāl, *Asrār-o-Ramūz* (Lahore: Ghulām 'Alī Publishers, 1997), 144.
[24] Al-Ṭalāq 65:32.
[25] Allāma Muhammad Ḥussain, *Sa'ādat al-Dāreyn fī Maqtal al-Hussain* (Sargodha: Maktabah al-Sibtain, n.d), 450.
[26] Al-Tūba 9:111.
[27] Mowlāna Rūm, *Miftāḥ al-'Uloom: Daftar-e-Awwal Ḥissa Chutha* (Lahore: Sheikh Ghulām 'Alī and Sons, n.d), 236.
[28] Mowlāna Rūm, *Miftāḥ al-'Uloom,* 250.
[29] Al-In'ām 6:120.
[30] Allāma al-Ḥāj, *Ṣaḥīfa-e-'Alawiya*, trans. Syed Murtazā Ḥussain (Lahore: Sheikh Ghulā'Alī ans Sons, n.d), 95.
[31] Mowlāna al-Syed, *Aṣul-e-Kāfī*, trans. Zafar Ḥassan Amrohovī (Karachi: Zafar Shameem Publications, 2009), 16.
[32] Al-Nisā' 4:142.
[33] Al-Mā'ūn 107:1.
[34] Al-Mā'ūn 107:2.
[35] Al-Mā'ūn 107:3.
[36] Al-Mā'ūn 107:4.
[37] Al-Mā'ūn 107:5.
[38] Al-Mā'ūn 107:6.
[39] Al-Mā'ūn 107:7.۱۲
[40] Al-Āl-e-Imrān 3:164.
[41] Al-Yūnas 10:62.
[42] Al-Baqarah 2:153.
[43] Al-Baqarah 2:156.
[44] Muhammad Ḥussain, *Sa'ādat al-Dāreyn fī Maqtal al-Hussain,* 466.
[45] Al-Fajar 89:27-28.۸
[46] Al-In'ām 6:162.
[47] Allāma Iqbāl, *Bāng-e-Darā* (Lahore: Ghulā 'Alī Publishers, 1974), 108.
[48] Ṭowsī, *Kitāb al-Lama'*, 96.
[49] Al-Nisā' 4:65.

[50] Allāma Ṭabāṭabāaī Āyatullah Maṭhrī and Āyatullah al-'Uzmā Khumeinī, *Seyr-o-Salook* (Karachi: Jāmi'a Ta'līmat-e-Islāmī, 1995), 141.
[51] Allāma Iqbāl, *Pas Chy bāyed Kard ay Aqwām-e-Sharak ma' Musāfir* (Lahore: Ghulām 'Alī Publishers, 1972), 23.
[52] Iqbāl, *Bāl-e-Jibreel*, 120.
[53] Iqbāl, *Bāl-e-Jibreel*, 120.
[54] Al-Dahar 76:25-26.
[55] Al-Ḥāj, *Ṣaḥīfa-e-'Alawiya,* 110.
[56] Allāma Iqbāl, *Zarb-Kaleem* (Lahore: Ghulām 'Alī Publishers, 1986), 93-94.
[57] Al-In'ām 6:70.
[58] Al-Mū'mineen 23:1-2-3.
[59] Al-Aḥzāb 33:4.
[60] Iqbāl, *Bāl-e-Jibreel*, 54.
[61] Iqbāl, *Zarb-e-Kaleem*, 41.
[62] Ṭabāṭabāaī, *Seyr-o-Salook*, 297.
[63] Al-Ḥadīd 57:33.
[64] Iqbāl, *Bāl-e-Jibreel*, 61.
[65] Al-'Ankabūt 29:69.
[66] Al-Tūba 9:60.
[67] Al-Āl-e-Imrān 3:169.
[68] Al-In'ām 6:122. ۲
[69] Ṭowsī, *Kitāb al-Lama'*, 54.
[70] Iqbāl, *Asrār-o-Ramūz*, 47.
[71] Iqbāl, *Asrār-o-Ramūz*, 48.
[72] Iqbāl, *Bāng-e-Darā*, 256.Ḍ
[73] Ṭowsī, *Kitāb al-Lama'*, 53.
[74] Iqbāl, *Bāng-e-Darā*, 270.